QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

الفتح

(۴۸)

QuranUrdu.com

الفتح

نام پہلی ہی آیت کے الفاظ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا سے ماخوذ ہے۔ یہ محض اس سورت کا نام ہی نہیں ہے بلکہ مضمون کے لحاظ سے بھی اس کا عنوان ہے، کیونکہ اس میں اُس فتحِ عظیم پر کلام کیا گیا ہے جو صلحِ حُدَیبیہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو عطا فرمائی تھی۔

زمانۂ نُزُول رِوایات اس پر متفق ہیں کہ اس کا نُزول ذی القَعدہ ۶ ھ میں اُس وقت ہوا تھا جب آپؐ کُفّارِ مکّہ سے صلحِ حُدَیبیہ کا معاہدہ کرنے کے بعد مدینۂ منورہ کی طرف واپس تشریف لے جا رہے تھے۔

تاریخی پَس منظر جن واقعات کے سلسلے میں یہ سورت نازل ہوئی، ان کی ابتدا اِس طرح ہوتی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اپنے اصحابؓ کے ساتھ مکّۂ معظّمہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں عُمرہ ادا فرمایا ہے۔ پیغمبر کا خواب ظاہر ہے کہ محض خواب و خیال نہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو وحی کی اقسام میں سے ایک قِسم ہے، اور آگے چل کر آیت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے خود توثیق کر دی ہے کہ یہ خواب ہم نے اپنے رسول کو دکھایا تھا۔ اس لیے درحقیقت یہ نرا خواب نہ تھا، بلکہ ایک الٰہی اشارہ تھا، جس کی پیروی کرنا حضورؐ کے لیے ضروری تھا۔

بظاہر اَسباب اِس ہدایت پر عمل کرنے کی کوئی صورت ممکن نظر نہ آتی تھی۔ کفارِ قریش نے ۶ سال سے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا، اور اس پُوری مدّت میں کسی مسلمان کو انھوں نے حج اور عُمرے تک کے لیے حُدودِ حرم کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا۔ اب آخر یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ کی ایک جمعیّت کے ساتھ مکّے میں داخل ہونے دیں گے۔ عُمرے کا احرام باندھ کر جنگی ساز و سامان ساتھ لیے ہوئے نکلنا گویا خود لڑائی کو دعوت دینا تھا، اور غیر مسلح جانے کے معنٰی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالنے کے تھے۔ اِن حالات میں کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اِس اشارے پر عمل کیا جائے تو کیسے۔

مگر پیغمبر کا منصب یہ تھا کہ اُس کا رب جو حکم بھی اس کو دے، وہ بے کھٹکے اس پر عمل کر گزرے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تأمُّل اپنا خواب صحابۂ کِرامؓ کو سُنا کر سفر کی تیاری شروع کر دی۔ آس پاس کے قبائل میں بھی آپؐ نے اعلانِ عام کرا دیا کہ ہم عُمرے کے لیے جا رہے ہیں، جو ہمارے ساتھ چلنا چاہے وہ آ جائے۔ جن لوگوں کی نگاہ ظاہری اسباب پر تھی، انھوں نے سمجھا کہ یہ لوگ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اُن

QuranUrdu.com

میں سے کوئی آپؐ کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مگر جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچّا ایمان رکھتے تھے انھیں اس امر کی کوئی پروا نہ تھی کہ انجام کیا ہوگا۔ ان کے لیے بس یہ کافی تھا کہ اللہ کا اشارہ ہے اور اس کا رسول تعمیلِ حکم کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد کوئی چیز ان کو رسولِ خدا کا ساتھ دینے سے نہ روک سکتی تھی۔ چودہ سو صحابی حضورؐ کی معیّت میں اس نہایت خطرناک سفر پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ذِی القَعْدہ ۶ ھ کے آغاز میں یہ مبارک قافلہ مدینے سے روانہ ہوا۔ ذُوالحُلَیفہ[1] پہنچ کر سب نے عُمرے کا اِحرام باندھا، قربانی کے لیے ۷۰ اُونٹ ساتھ لیے جن کی گردنوں میں ہَدْی کی علامت کے طور پر قلادے پڑے ہوئے تھے۔ پَرتلوں میں صرف ایک ایک تلوار رکھ لی، جس کی تمام زائرینِ حرم کو عرب کے معروف قاعدے کے مطابق اجازت تھی، اور اس کے سوا کوئی سامانِ جنگ ساتھ نہ لیا۔ اس طرح یہ قافلہ لبّیک لبّیک کی صدائیں بلند کرتا ہوا بیت اللہ کی طرف چل پڑا۔

اُس وقت مکّہ اور مدینہ کے تعلقات کی جو نوعیت تھی، عرب کا بچّہ بچّہ اس کو جانتا تھا۔ ابھی پچھلے سال ہی تو شوال ۵ ھ میں قریش نے قبائلِ عرب کی مُتّحِدہ طاقت کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی تھی اور غَزوۂ اَحزاب کا مشہور معرکہ پیش آ چکا تھا۔ اس لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِتنے بڑے قافلے کے ساتھ اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو پُورے عرب کی نگاہیں اِس عجیب سفر کی طرف مرکوز ہو گئیں، اور لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ قافلہ لڑنے کے لیے نہیں جا رہا ہے، بلکہ ماہِ حرام میں، اِحرام باندھ کر، ہَدْی کے اُونٹ ساتھ لیے ہوئے بیت اللہ کا طواف کرنے جا رہا ہے اور قطعی طور پر غیر مسلّح ہے۔

قریش کے لوگوں کو حضورؐ کے اِس اقدام نے سخت پریشانی میں ڈال دیا۔ ذی القَعْدہ کا مہینا اُن حرام مہینوں میں سے تھا جو صدہا برس سے عرب میں حج و زیارت کے لیے محترم سمجھے جاتے تھے۔ اِس مہینے میں جو قافلہ اِحرام باندھ کر حج یا عُمرے کے لیے جا رہا ہو، اُسے روکنے کا کسی کو حق نہ تھا، حتّٰی کہ کسی قبیلے سے اُس کی دشمنی بھی ہو تو عرب کے مُسَلَّمہ قوانین کی رُو سے وہ اپنے علاقے سے اس کے گزرنے میں مانع نہ ہو سکتا تھا۔ قریش کے لوگ اِس اُلجھن میں پڑ گئے کہ اگر ہم مدینے کے اِس قافلے پر حملہ کر کے اسے مکّۂ معظّمہ میں داخل ہونے سے روکتے ہیں تو پورے ملک میں اس پر شور مچ جائے گا۔ عرب کا ہر شخص پکار اُٹھے گا کہ یہ سراسر زیادتی ہے۔ تمام قبائلِ عرب یہ سمجھیں گے کہ ہم خانۂ کعبہ کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ ہر قبیلہ اِس تشویش میں مبتلا ہو جائے گا کہ آیندہ کسی کو حج اور عمرہ کرنے دینا یا نہ کرنے دینا اب ہماری مرضی پر موقوف ہے، جس سے بھی ہم ناراض ہوں گے اسے بیت اللہ کی زیارت کرنے سے اسی طرح روک دیں گے جس طرح آج مدینے کے اِن زائرین کو روک رہے ہیں۔ یہ ایسی غَلَطی ہو گی جس سے سارا عرب ہم سے منحرف ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ مَقام مدینے سے مکّے کی جانب تقریباً ۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اب اسے بِئرِ علی کہتے ہیں، اور مدینے کے حاجی اِسی مقام سے حج اور عُمرے کا اِحرام باندھتے ہیں۔

QuranUrdu.com

کو اتنے بڑے قافلے کے ساتھ بخیریت اپنے شہر میں داخل ہو جانے دیتے ہیں تو پُورے ملک میں ہماری ہوا اکھڑ جائے گی، اور لوگ کہیں گے کہ ہم محمدؐ سے مرعوب ہو گئے۔ آخرکار بڑی شش و پنج کے بعد اُن کی جاہلانہ حمیّت ہی اُن پر غالب آ کر رہی، اور انھوں نے اپنی ناک کی خاطر یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی قیمت پر بھی اس قافلے کو اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی کَعب کے ایک شخص کو مُخبر کی حیثیت سے آگے بھیج رکھا تھا، تاکہ وہ قریش کے ارادوں اور ان کی نقل و حرکت سے آپؐ کو بروقت مُطّلع کرتا رہے۔ جب آپؐ عُسفان[1] پہنچے تو اُس نے آ کر آپؐ کو اطلاع دی کہ قریش کے لوگ پُوری تیاری کے ساتھ ذی طُویٰ[2] کے مقام پر پہنچ گئے ہیں، اور خالد بن ولید کو انھوں نے دو سو سواروں کے ساتھ کُراعُ الغَمیم[3] کی طرف آگے بھیج دیا ہے تاکہ وہ آپؐ کا راستہ روکیں۔ قریش کی چال یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح آنحضرتؐ کے ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے اُن کو اشتعال دلائیں، اور پھر اگر لڑائی ہو جائے تو پورے ملک میں یہ مشہور کر دیں کہ یہ لوگ دراصل آئے تھے لڑنے کے لیے، مگر بہانہ انھوں نے عُمرے کا کیا تھا اور اِحرام محض دھوکا دینے کے لیے باندھ رکھا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع پاتے ہی فوراً راستہ بدل دیا اور ایک نہایت دشوار گزار راستے سے سخت مَشَقَّت اُٹھا کر حُدَیبِیَہ[4] کے مَقام پر پہنچ گئے جو عین حَرم کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں بنی خُزاعہ کا سردار بُدَیل بن وَرقا اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کے ساتھ آپؐ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کس غرض کے لیے آئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے، صرف بیت اللہ کی زیارت اور اس کا طواف ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہی بات اِن لوگوں نے جا کر قریش کے سرداروں کو بتا دی اور اُن کو مشورہ دیا کہ وہ اِن زائرینِ حَرم کا راستہ نہ روکیں۔ مگر وہ اپنی ضد پر اَڑے رہے اور انھوں نے اَحابِیش[5] کے سردار حُلَیس بن عَلقَمہ کو حضورؐ کے پاس بھیجا، تاکہ وہ آپؐ کو واپس جانے پر آمادہ کرے۔ سردارانِ قریش کا مقصد یہ تھا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی بات نہ مانیں گے تو وہ ان سے ناراض ہو کر پلٹے گا اور پھر اَحابِیش کی پوری طاقت ہمارے ساتھ ہو گی۔ مگر جب اس نے آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا قافلہ احرام بند ہے، ہَدی کے اُونٹ سامنے کھڑے ہیں

---

[1] یہ مقام مدینہ سے مکّہ کے راستے پر، مکّہ سے تقریباً دو دن کی مَسافت پر واقع ہے۔ (یعنی اونٹ کی سواری پر یہاں سے مکّہ پہنچنے میں دو دن لگتے ہیں۔)

[2] مکّے سے باہر عُسفان کے راستے پر ایک مقام۔

[3] عُسفان سے آٹھ میل کے فاصلے پر، مکّے کی جانب۔

[4] یہ مَقام جِدّہ سے مکّہ جانے والی سڑک پر ٹھیک اُس جگہ واقع ہے جہاں سے حُدودِ حرم شروع ہوتی ہیں۔ اب اسے شُمَیسی کہتے ہیں۔ مکّے سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۳ میل ہے۔

[5] یہ اطرافِ مکہ میں رہنے والے چند قبائل کا مجموعہ تھا جس سے قریش کے حلیفانہ تعلقات تھے۔

QuranUrdu.com

جن کی گردنوں میں قلادے پڑے ہوئے ہیں، اور یہ لوگ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے آئے ہیں تو وہ حضورؐ سے کوئی بات کیے بغیر مکّے کی طرف پلٹ گیا اور اس نے جا کر قریش کے سرداروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ لوگ بیت اللہ کی عظمت مان کر اس کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ اگر تم ان کو روکو گے تو اَحابیش اِس کام میں تمھارا ساتھ ہرگز نہ دیں گے۔ ہم تمھارے حلیف اس لیے نہیں بنے ہیں کہ تم حُرمتوں کو پامال کرو اور ہم اس میں تمھاری حمایت کریں۔

پھر قریش کی طرف سے عُرْوَہ بن مسعود ثَقَفی آیا اور اس نے اپنے نزدیک بڑی اُونچ نیچ سمجھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپؐ مکّے میں داخل ہونے کے ارادے سے باز آ جائیں، مگر آپؐ نے اس کو بھی وہی جواب دیا جو بنی خُزاعہ کے سردار کو دیا تھا کہ ہم لڑائی کے ارادے سے نہیں آئے ہیں، بلکہ بیت اللہ کی تعظیم کرنے والے بن کر ایک دینی فریضہ بجا لانے کے لیے آئے ہیں۔ واپس جا کر عُرْوَہ نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ مَیں قیصر و کِسریٰ اور نَجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں، مگر خدا کی قسم! میں نے اصحابِ محمدؐ کو جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فدائی دیکھا ہے، ایسا منظر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں دیکھا۔ اِن لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب پانی کا ایک قطرہ تک زمین پر نہیں گرنے دیتے اور سب اپنے جسم اور کپڑوں پر مَل لیتے ہیں۔ اب تم لوگ سوچ لو کہ تمھارا مقابلہ کس سے ہے۔

اس دوران میں، جب کہ ایلچیوں کی آمد و رفت اور گفت و شنید کا یہ سلسلہ جاری تھا، قریش کے لوگ بار بار یہ کوشش کرتے رہے کہ چپکے سے حضورؐ کے کیمپ پر چھاپے مار کر صحابہؓ کو اشتعال دلائیں اور کسی نہ کسی طرح اُن سے کوئی ایسا اقدام کرا لیں جس سے لڑائی کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ مگر ہر مرتبہ صحابہؓ کے صبر و ضبط اور حضورؐ کی حکمت و فراست نے ان کی ساری تدبیروں کو ناکام کر دیا۔ ایک دفعہ ان کے چالیس پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر پتھر اور تیر برسانے لگے۔ صحابہؓ نے ان سب کو گرفتار کر کے حضورؐ کے سامنے پیش کر دیا، مگر آپؐ نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ ایک اور موقع پر تَنْعِیم[1] کی طرف سے ۸۰ آدمی عین نمازِ فجر کے وقت آئے اور انھوں نے اچانک چھاپا مار دیا۔ یہ لوگ بھی پکڑے گئے، مگر حضورؐ نے انھیں بھی رہا کر دیا۔ اِس طرح قریش کو اپنی ہر چال اور ہر تدبیر میں ناکامی ہوتی چلی گئی۔

آخر کار حضورؐ نے خود اپنی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایلچی بنا کر مکّہ بھیجا اور ان کے ذریعے سے سردارانِ قریش کو یہ پیغام دیا کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ زیارت کے لیے ہدی ساتھ لے کر آئے ہیں، طواف اور قربانی کر کے واپس چلے جائیں گے۔ مگر وہ لوگ نہ مانے اور حضرت عثمانؓ کو مکّہ ہی میں روک لیا۔ اس دوران

---

[1] یہ مکّے کے قریب حُدودِ حرم سے باہر ایک مقام ہے۔ مکّے کے لوگ بالعُموم عُمرہ کرنے کی خاطر اسی مَقام پر جا کر احرام باندھتے ہیں اور پھر واپس آ کر عمرہ ادا کرتے ہیں۔

QuranUrdu.com

میں یہ خبر اُڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیے گئے ہیں، اور ان کے واپس نہ آنے سے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ یہ خبر سچّی ہے۔ اب مزید تحمُّل کا کوئی موقع نہ تھا۔ مکے میں داخلے کی بات تو دوسری تھی، اس کے لیے طاقت کا استعمال ہرگز پیشِ نظر نہ تھا۔ مگر جب نوبت سفیر کے قتل تک پہنچ گئی تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اِس بات پر بیعت لی کہ اب یہاں سے ہم مرتے دم تک پیچھے نہ ہٹیں گے۔ موقع کی نزاکت نگاہ میں ہو تو آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی معمولی بیعت نہ تھی۔ مسلمان صرف ۱۴ سو تھے اور کسی سامانِ جنگ کے بغیر آئے تھے۔ اپنے مرکز سے ڈھائی سو میل دُور، عین مکّہ کی سرحد پر ٹھیرے ہوئے تھے، جہاں دشمن اپنی پُوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو سکتا تھا اور گردوپیش سے اپنے حامی قبیلوں کو لا کر بھی انھیں گھیرے میں لے سکتا تھا۔ اس کے باوجود ایک شخص کے سوا پورا قافلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مرنے مارنے کی بیعت کرنے کے لیے بلا تأمُّل آمادہ ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے اخلاصِ ایمانی اور راہِ خدا میں ان کی فدائیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ یہی وہ بیعت ہے جو بیعتِ رضوان کے نام سے تاریخِ اسلام میں مشہور ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر غَلَط تھی۔ حضرت عثمانؓ خود بھی واپس آ گئے اور قریش کی طرف سے سُہَیل بن عَمْرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ اب قریش اپنی اِس ضد سے ہٹ گئے تھے کہ وہ حضورؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو سرے سے مکے میں داخل ہی نہ ہونے دیں گے۔ البتہ اپنی ناک بچانے کے لیے ان کو صرف یہ اصرار تھا کہ آپ اِس سال واپس چلے جائیں، آیندہ سال آپ عمرے کے لیے آ سکتے ہیں۔ طویل گفت وشنید کے بعد جن شرائط پر صلح نامہ لکھا گیا، وہ یہ تھیں:

(۱) دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی، اور ایک دوسرے کے خلاف خفیہ یا عَلانِیَہ کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔

(۲) اس دَوران میں قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا اسے آپؐ واپس کر دیں گے، اور آپؐ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس چلا جائے گا اسے وہ واپس نہ کریں گے۔

(۳) قبائلِ عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف بن کر اِس معاہدے میں شامل ہونا چاہے گا اُسے اِس کا اختیار ہو گا۔

(۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس سال واپس جائیں گے اور آیندہ سال وہ عمرے کے لیے آ کر تین دن مکّے میں ٹھیر سکتے ہیں، بشرطیکہ پَرتلوں میں صرف ایک ایک تلوار لے کر آئیں، اور کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ لائیں۔

QuranUrdu.com

اِن تین دنوں میں اہلِ مکّہ اُن کے لیے شہر خالی کر دیں گے (تاکہ کسی تصادُم کی نوبت نہ آئے)۔ مگر واپس جاتے ہوئے وہ یہاں کے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

جس وقت اس معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں، مسلمانوں کا پورا لشکر سخت مضطرب تھا۔ کوئی شخص بھی اُن مَصلَحتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا جنھیں نگاہ میں رکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ شرائط قبول فرما رہے تھے۔ کسی کی نظر اتنی دُور رَس نہ تھی کہ اس صلح کے نتیجے میں جو خیرِ عظیم رونما ہونے والی تھی، اسے دیکھ سکے۔ کفارِ قریش اسے اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے، اور مسلمان اِس پر بے تاب تھے کہ ہم آخر دب کر یہ ذلیل شرائط کیوں قبول کریں۔ حضرت عمرؓ جیسے بالغ النظر مدبّر تک کا یہ حال تھا کہ وہ کہتے ہیں: مسلمان ہونے کے بعد کبھی میرے دل میں شک نے راہ نہ پائی تھی، مگر اس موقع پر میں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ بے چین ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا: ''کیا حضورؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا یہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ پھر آخر ہم اپنے دین کے معاملے میں یہ ذلّت کیوں اختیار کریں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''اے عمر! وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ ان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔'' پھر اُن سے صبر نہ ہوا۔ جا کر یہی سوالات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کیے، اور حضورؐ نے بھی ان کو ویسا ہی جواب دیا جیسا حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ مدّتوں اس گفتگو پر نادم رہے جو انھوں نے اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی اور صدقات و نوافل ادا کرتے رہے، تاکہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے۔

سب سے زیادہ دو باتیں اس مُعاہَدے میں لوگوں کو بُری طرح کَھل رہی تھیں۔ ایک، شرط نمبر ۲، جس کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ یہ صریح نامُساوی شرط ہے۔ اگر مکّے سے بھاگ کر آنے والوں کو ہم واپس کریں تو مدینے سے بھاگ کر جانے والے کو وہ کیوں نہ واپس کریں؟ حضورؐ نے اِس پر فرمایا: جو ہمارے ہاں سے بھاگ کر اُن کے پاس چلا جائے، وہ آخر ہمارے کس کام کا ہے؟ اللہ اسے ہم سے دُور ہی رکھے۔ اور جو اُن کے ہاں سے بھاگ کر ہمارے پاس آ جائے، اسے اگر ہم واپس کر دیں گے تو اللہ اس کے لیے خلاصی کی کوئی اور صورت پیدا فرما دے گا۔ دوسری چیز جو لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی، وہ چوتھی شرط تھی۔ مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے ماننے کے معنٰی یہ ہیں کہ تمام عرب کے سامنے گویا ہم ناکام واپس جا رہے ہیں۔ مزید برآں یہ سوال بھی دلوں میں خلش پیدا کر رہا تھا کہ حضورؐ نے تو خواب میں یہ دیکھا تھا کہ ہم مکّے میں طواف کر رہے ہیں، مگر یہاں تو ہم طواف کیے بغیر واپس جانے کی شرط مان رہے ہیں۔ حضورؐ نے اس پر لوگوں کو سمجھایا کہ خواب میں آخر اِسی سال طواف کرنے کی صراحت تو نہ تھی۔ شرائطِ صلح کے مطابق اِس سال نہیں تو اگلے سال اِن شاء اللہ طواف ہو گا۔

جلتی پر تیل کا کام جس واقعے نے کیا، وہ یہ تھا کہ عین اُس وقت جب صلح کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا، سُہَیل بن عَمْرو کے اپنے صاحبزادے ابو جَنْدَل، جو مسلمان ہو چکے تھے اور کفّارِ مکّہ نے ان کو قید کر رکھا تھا،

QuranUrdu.com

کسی نہ کسی طرح بھاگ کر حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور جسم پر تشدُّد کے نشانات تھے۔ انھوں نے حضورؐ سے فریاد کی کہ مجھے اِس حبسِ بے جا سے نجات دلائی جائے۔ صحابۂ کرامؓ کے لیے یہ حالت دیکھ کر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ مگر سُہَیل بن عَمْرو نے کہا کہ صلح نامے کی تحریر چاہے مکمل نہ ہوئی ہو، شرائط تو ہمارے اور آپ کے درمیان طے ہو چکی ہیں، اس لیے اس لڑکے کو میرے حوالے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حجت تسلیم فرمالی اور ابوجَندَل ظالموں کے حوالے کر دیے گئے۔

صلح سے فارغ ہو کر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اب یہیں قربانی کر کے سر منڈواؤ اور اِحرام ختم کر دو۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ حضورؐ نے تین مرتبہ حکم دیا، مگر صحابہؓ پر اُس وقت رنج وغم اور دل شکستگی کا ایسا شدید غلبہ تھا کہ انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی۔ حضورؐ کے پُورے دَورِ رسالت میں اس ایک موقع کے سوا کبھی یہ صورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ صحابہؓ کو حکم دیں اور وہ اس کی تعمیل کے لیے دوڑ نہ پڑیں۔ حضورؐ کو اس پر سخت صدمہ ہوا اور آپؐ نے اپنے خیمے میں جا کر اُمّ المومنین حضرت اُمّ سَلَمہؓ سے اپنی کبیدہ خاطری کا اظہار فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا کہ آپؐ بس خاموشی کے ساتھ تشریف لے جا کر خود اپنا اُونٹ ذبح فرمائیں اور حجّام کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیں۔ اس کے بعد لوگ خود بخود آپؐ کے عمل کی پیروی کریں گے اور سمجھ لیں گے کہ جو فیصلہ ہو چکا ہے وہ اب بدلنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور آپؐ کے فعل کو دیکھ کر لوگوں نے بھی قربانیاں کر لیں، سر منڈوا لیے یا بال ترشوا لیے اور اِحرام سے نکل آئے۔ مگر دل اُن کے غم سے کٹے جا رہے تھے۔

اس کے بعد جب یہ قافلہ حُدَیْبیَہ کی صلح کو اپنی شکست اور ذلّت سمجھتا ہوا مدینے کی طرف واپس جا رہا تھا، اُس وقت ضَجْنان[1] کے مقام پر (یا بقولِ بعض کُراعُ الغَمِیم کے مقام پر) یہ سورت نازل ہوئی، جس نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ صلح جس کو وہ شکست سمجھ رہے ہیں، دراصل فتحِ عظیم ہے۔ اس کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا: آج مجھ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے جو میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔ پھر یہ سورت آپؐ نے تلاوت فرمائی اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کو بلا کر اسے سُنایا، کیونکہ وہ سب سے زیادہ رنجیدہ تھے۔

اگرچہ اہلِ ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سُن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے، مگر کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ اِس صلح کے فوائد ایک ایک کر کے کُھلتے چلے گئے، یہاں تک کہ کسی کو بھی اس امر میں شک نہ رہا کہ فی الواقع یہ صلح ایک عظیم الشان فتح تھی۔

۱- اس میں پہلی مرتبہ عرب میں اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی حیثیت محض قریش اور قبائلِ عرب کے خلاف

---

[1] مکّے سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

QuranUrdu.com

خُروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ ان کو برادری باہر (outlaw) سمجھتے تھے۔ اب خود قریش ہی نے آپؐ سے معاہدہ کر کے سلطنتِ اسلامی کے مقبوضات پر آپؐ کا اقتدار مان لیا اور قبائلِ عرب کے لیے یہ دروازہ بھی کھول دیا کہ اِن دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ مُعَاہَدات کر لیں۔

۲- مسلمانوں کے لیے زیارتِ بیت اللہ کا حق تسلیم کر کے قریش نے آپ سے آپ گویا یہ بھی مان لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے، جیسا کہ وہ اب تک کہتے چلے آ رہے تھے، بلکہ عرب کے مُسَلَّمہ ادیان میں سے ایک ہے، اور دوسرے عربوں کی طرح اس کے پَیرو بھی حج و عمرہ کے مَناسِک ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس سے اہلِ عرب کے دلوں کی وہ نفرت کم ہوگئی جو قریش کے پروپیگنڈے سے اسلام کے خلاف پیدا ہو گئی تھی۔

۳- دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے سے مسلمانوں کو امن میسّر آ گیا اور انھوں نے عرب کے تمام اطراف و نواح میں پھیل کر اِس تیزی سے اسلام کی اشاعت کی کہ صلحِ حُدَیْبِیَہ سے پہلے پُورے ۱۹ سال میں اُتنے آدمی مسلمان نہ ہوئے تھے جتنے اس کے بعد دو سال کے اندر ہو گئے۔ یہ اِسی صلح کی برکت تھی کہ یا تو وہ وقت تھا جب حُدَیْبِیَہ کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ صرف ۱۴ سو آدمی آئے تھے، یا دو ہی سال کے بعد جب قریش کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضورؐ نے مکّے پر چڑھائی کی تو دس ہزار کا لشکر آپؐ کے ہمرِکاب تھا۔

۴- قریش کی طرف سے جنگ بند ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع مل گیا کہ اپنے مقبوضات میں اسلامی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیں اور اسلامی قانون کے اجرا سے مسلم معاشرے کو ایک مکمل تہذیب و تمدُّن بنا دیں۔ یہی وہ نعمتِ عُظمیٰ ہے جس کے متعلّق اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں فرمایا کہ ”آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔“ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، دیباچۂ سورۂ مائدہ، اور حاشیہ ۱۵)

۵- قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شِمالِ عرب اور وسطِ عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخَّر کر لیا۔ صلحِ حُدَیْبِیَہ پر تین ہی مہینے گزرے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ، خیبر فتح ہو گیا، اور اس کے بعد فَدَک، وادی القُریٰ، تَیما اور تَبوک کی یہودی بستیاں اسلام کے زیرِ نگیں آتی چلی گئیں۔ پھر وسطِ عرب کے وہ تمام قبیلے بھی، جو یہود اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے، ایک ایک کر کے تابعِ فرمان ہو گئے۔ اس طرح حُدَیْبِیَہ کی صلح نے دو ہی سال کے اندر عرب میں قوّت کا تَوازُن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

یہ تھیں وہ برکات جو مسلمانوں کو اُس صلح سے حاصل ہوئیں جسے وہ اپنی ناکامی اور قریش اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ جو چیز اِس صلح میں مسلمانوں کو ناگوار ہوئی تھی اور جسے قریش نے اپنی جیت

QuranUrdu.com

سمجھا تھا، وہ یہ تھی کہ مکّہ سے بھاگ کر مدینہ جانے والوں کو واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے بھاگ کر مکّہ جانے والوں کو واپس نہ کیا جائے گا۔ مگر تھوڑی ہی مدّت گزری تھی کہ یہ معاملہ بھی قریش پر اُلٹا پڑا اور تجربے نے بتا دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ دُوررس نے اِس کے کن نتائج کو دیکھ کر یہ شرط قبول کی تھی۔ صلح کے کچھ دنوں بعد مکّے سے ایک مسلمان ابوبَصیرؓ قریش کی قید سے بھاگ نکلے اور مدینہ پہنچے۔ قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور حضورؐ نے مُعاہَدے کے مطابق انھیں اُن لوگوں کے حوالے کر دیا جو ان کی گرفتاری کے لیے مکّے سے بھیجے گئے تھے۔ مگر مکّہ جاتے ہوئے راستے میں وہ پھر ان کی گرفت سے بچ نکلے اور ساحلِ بحرِ اَحمر کے اُس راستے پر جا بیٹھے جس سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس کے بعد جس مسلمان کو بھی قریش کی قید سے بھاگ نکلنے کا موقع ملتا، وہ مدینہ جانے کے بجائے ابوبَصیرؓ کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا، یہاں تک کہ ۷۰ آدمی وہاں جمع ہوگئے اور انھوں نے قریش کے قافلوں پر چھاپے مار مار کر ان کا ناطِقہ تنگ کر دیا۔ آخرکار قریش نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مدینہ بلا لیں، اور حُدَیبیہ کے معاہدے کی وہ شرط آپ سے آپ ساقط ہوگئی۔

یہ تاریخی پَس منظر نگاہ میں رکھ کر اِس سورہ کو پڑھا جائے تو اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

QuranUrdu.com

آیاتہا ۲۹ — رکوعاتہا ۴

سُوْرَۃُ الْفَتْحِ مَدَنِیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ
مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲

اے نبیؐ! ہم نے تم کو کُھلی فتح عطا کر دی[1]، تاکہ اللہ تمھاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے[2] اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے[3] اور تمھیں سیدھا راستہ دکھائے[4]

۱- صلحِ حُدَیبیہ کے بعد جب فتح کا یہ مُژدہ سنایا گیا تو لوگ حیران تھے کہ آخر اس صلح کو فتح کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ایمان کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو مان لینے کی بات تو دوسری تھی، مگر اس کے فتح ہونے کا پہلو کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ آیت سُن کر پوچھا: یا رسولؐ اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں۔ (ابنِ جَرِیر) ایک اور صحابی حاضر ہوئے اور انھوں نے بھی یہی سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: اِیْ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ اِنَّہٗ لَفَتْحٌ۔ ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، یقیناً یہ فتح ہے۔'' (مُسنَدِ احمد، ابوداؤد) مدینہ پہنچ کر ایک اور صاحب نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''یہ کیسی فتح ہے؟ ہم بیت اللہ جانے سے روک دیے گئے، ہماری قربانی کے اُونٹ بھی آگے نہ جا سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حُدَیبیہ ہی میں رُک جانا پڑا، اور اس صلح کی بدولت ہمارے دو مظلوم بھائیوں (ابوجَندلؓ اور ابوبَصیرؓ) کو ظالموں کے حوالے کر دیا گیا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ''بڑی غلط بات کہی گئی ہے یہ۔ حقیقت میں تو یہ بہت بڑی فتح ہے۔ تم مشرکوں کے عین گھر پر پہنچ گئے اور انھوں نے آیندہ سال عمرہ کرنے کی درخواست کر کے تمھیں واپس جانے پر راضی کیا۔ انھوں نے تم سے خود جنگ بند کر دینے اور صلح کر لینے کی خواہش کی، حالانکہ ان کے دلوں میں تمھارے لیے جیسا کچھ بُغض ہے، وہ معلوم ہے۔ اللہ نے تم کو ان پر غلبہ عطا کر دیا ہے۔ کیا وہ دن بھول گئے جب اُحُد میں تم بھاگے جا رہے تھے اور میں تمھیں پیچھے سے پکار رہا تھا؟ کیا وہ دن بُھول گئے جب جنگِ اَحزاب میں ہر طرف سے دشمن چڑھ آئے تھے اور کلیجے منہ کو آ رہے تھے؟'' (بَیہَقی بروایتِ عُروَہؓ بن زبیرؓ) مگر کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ اس صلح کا فتح ہونا بالکل عیاں ہوتا چلا گیا اور ہر خاص و عام پر یہ بات پوری طرح کھل گئی کہ فی الواقع اسلام کی فتح کا آغاز صلحِ حُدَیبیہ ہی سے ہوا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت جابر بن عبداللہؓ، اور حضرت بَراءؓ بن عازِب، تینوں حضرات سے قریب قریب ایک ہی معنیٰ میں یہ قول منقول ہوا ہے کہ ''لوگ فتحِ مکّہ کو فتح کہتے ہیں، حالانکہ ہم اصل فتح حُدَیبیہ کو سمجھتے ہیں۔'' (بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ابنِ جَرِیر)

۲- جس موقع و محل پر یہ فقرہ ارشاد ہوا ہے، اسے نگاہ میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں جن کوتاہیوں

QuranUrdu.com

سے درگزر کرنے کا ذکر ہے، ان سے مراد وہ خامیاں ہیں جو اسلام کی کامیابی و سربلندی کے لیے کام کرتے ہوئے اُس سعی و جُہد میں رہ گئی تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں پچھلے ۱۹ سال سے مسلمان کر رہے تھے۔ یہ خامیاں کسی انسان کے علم میں نہیں ہیں، بلکہ انسانی عقل تو اُس جِدّوجُہد میں کوئی نَقص تلاش کرنے سے قطعی عاجز ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کمال کا جو بلند ترین معیار ہے، اس کے لحاظ سے اُس میں کچھ ایسی خامیاں تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کو اتنی جلدی مشرکینِ عرب پر فیصلہ کُن فتح حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ان خامیوں کے ساتھ اگر تم جِدّوجُہد کرتے رہتے تو عرب کے مُسَخَّر ہونے میں ابھی عرصۂ دراز درکار تھا، مگر ہم نے ان ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں سے درگزر کر کے محض اپنے فضل سے اُن کی تلافی کر دی، اور حُدَیبیہ کے مَقام پر تمھارے لیے اُس فتح وظفر کا دروازہ کھول دیا جو معمول کے مطابق تمھاری اپنی کوششوں سے نصیب نہ ہوسکتی تھی۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کسی مقصد کے لیے ایک جماعت جو کوشش کر رہی ہو، اُس کی خامیوں کے لیے اُس جماعت کے قائد و رہنما ہی کو مُخاطَب کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ خامیاں قائد کی ذاتی خامیاں ہیں۔ دراصل وہ اُس جِدّوجُہد کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو پُوری جماعت بحیثیتِ مجموعی کر رہی ہوتی ہے۔ مگر خطاب قائد سے کیا جاتا ہے کہ آپ کے کام میں یہ کمزوریاں ہیں۔

تاہم چونکہ روئے سُخن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، اور فرمایا یہ گیا ہے کہ اللہ نے آپؐ کی ہر اگلی پچھلی کوتاہی کو معاف فرما دیا، اس لیے اِن عام الفاظ سے یہ مضمون بھی نکل آیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کے رسولِ پاکؐ کی تمام لَغزشیں (جو آپؐ کے مَقامِ بلند کے لحاظ سے لغزشیں تھیں) بخش دی گئیں۔ اسی بنا پر جب صحابۂ کرامؓ حضورؐ کو عبادت میں غیر معمولی مَشَقَّتیں اُٹھاتے ہوئے دیکھتے تھے تو عرض کرتے تھے کہ آپؐ کے تو سب اگلے پچھلے قصور معاف ہو چکے ہیں، پھر آپؐ اپنی جان پر اتنی سختی کیوں اٹھاتے ہیں؟ اور آپؐ جواب میں فرماتے تھے: افلا اکون عبدًا شکورًا ''کیا میں ایک شکرگزار بندہ نہ بنوں؟'' (احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد)

۳- نعمت کی تکمیل سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اپنی جگہ ہر خوف، ہر مُزاحَمت اور ہر بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح اسلامی تمدُّن و تہذیب اور اسلامی قوانین و احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں، اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے کہ وہ دنیا میں اللہ کا کَلِمہ بلند کر سکیں۔ کفر و فسق کا غلبہ، جو بندگیِ رب کی راہ میں مانع اور اعلائے کَلِمَۃُ اللہ کی سعی میں مُزاحِم ہو، اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے، جسے قرآن ''فتنہ'' قرار دیتا ہے۔ اِس فتنے سے خلاصی پا کر جب ان کو ایک ایسا دارالاسلام میسّر آ جائے جس میں اللہ کا پُورا دین بے کم و کاست نافذ ہو، اور اس کے ساتھ ان کو ایسے ذرائع و وسائل بھی بہم پہنچ جائیں جن سے وہ خدا کی زمین پر کفر و فسق کی جگہ ایمان و تقویٰ کا سکّہ رواں کر سکیں، تو یہ ان پر اللہ کی نعمت کا اِتمام ہے۔ یہ نعمت چونکہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت حاصل ہوئی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ ہی کو مُخاطَب کر کے فرمایا کہ ہم تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دینا چاہتے تھے، اس لیے یہ فتح ہم نے تم کو عطا کر دی۔

۴ – اِس مَقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدھا راستہ دکھانے کا مطلب آپؐ کو فتح و کامرانی کا راستہ دکھانا

QuranUrdu.com

وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ
فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ
جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴

اور تم کو زبردست نُصرت بخشے۔[۵] وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی،[۶] تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں۔[۷] زمین اور آسمانوں کے سب لشکر اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حکیم ہے۔[۸] (اُس نے یہ کام اِس لیے کیا ہے)

ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حُدَیْبِیَہ کے مَقام پر صلح کا یہ معاہدہ کرا کے آپؐ کے لیے وہ راہ ہموار کر دی اور وہ تدبیر آپؐ کو سُجھا دی جس سے آپؐ اسلام کی مُزاحمت کرنے والی تمام طاقتوں کو مغلوب کر لیں۔

۵- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''تم کو بے مثل نُصرت بخشے''۔ اصل میں لفظ نَصْرًا عَزِيْزًا استعمال ہوا ہے۔ عزیز کے معنیٰ زبردست کے بھی ہیں اور بے نظیر، بے مثل اور نادر کے بھی۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اس صلح کے ذریعے سے اللہ نے آپؐ کی ایسی مدد کی ہے جس سے آپؐ کے دشمن عاجز ہو جائیں گے۔ اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ شاذ و نادر ہی کبھی کسی کی مدد کا ایسا عجیب طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ بظاہر جو چیز لوگوں کو محض ایک صلح نامہ، اور وہ بھی دب کر کیا ہوا صلح نامہ نظر آتی ہے، وہی ایک فیصلہ کُن فتح بن جانے والی ہے۔

۶- ''سکینت'' عربی زبان میں سُکون و اطمینان اور ثباتِ قلب کو کہتے ہیں، اور یہاں اللہ تعالیٰ مومنوں کے دل میں اُس کے نازل کیے جانے کو اُس فتح کا ایک اہم سبب قرار دے رہا ہے جو حُدَیْبِیَہ کے مَقام پر اسلام اور مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ اُس وقت کے حالات پر تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ کس قسم کی سکینت تھی جو اس پُورے زمانے میں مسلمانوں کے دلوں میں اُتاری گئی اور کیسے وہ اِس فتح کا سبب بنی۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عُمرے کے لیے مکّۂ معظّمہ جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا، اگر مسلمان اُس وقت خوف زدگی میں مبتلا ہو جاتے اور منافقین کی طرح یہ سوچنے لگتے کہ یہ تو صریحاً موت کے منہ میں جانا ہے، یا جب راستے میں یہ اطلاع ملی کہ کفارِ قریش لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں، اُس وقت اگر مسلمان اس گھبراہٹ میں مبتلا ہو جاتے کہ ہم کسی جنگی ساز و سامان کے بغیر دشمن کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے، اور اِس بنا پر ان کے اندر بھگدڑ مچ جاتی، تو ظاہر ہے کہ وہ نتائج کبھی رُونما نہ ہوتے جو حُدَیْبِیَہ میں رُونما ہوئے۔ پھر جب حُدَیْبِیَہ کے مقام پر کفّار نے مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکا، اور جب انھوں نے چھاپے اور شبخون مار مار کر مسلمانوں کو اِشتِعال دلانے کی کوشش کی، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی، اور جب ابوجَنْدَلؓ مظلومیت کی تصویر بنے ہوئے مجمعِ عام میں آ کھڑے ہوئے، ان میں سے ہر موقع ایسا تھا کہ اگر مسلمان اشتعال میں آ کر اُس نظم و ضبط کو توڑ ڈالتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم

QuranUrdu.com

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

تاکہ مومن مردوں اور عورتوں[۹] کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنّتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے

کیا تھا تو سارا کام خراب ہو جاتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن شرائط پر صلح نامہ طے کرنے لگے جو مسلمانوں کی پُوری جماعت کو سخت ناگوار تھیں، اُس وقت اگر وہ حضورؐ کی نافرمانی کرنے پر اُتر آتے تو حُدَیبیہ کی فتحِ عظیم شکستِ عظیم میں تبدیل ہو جاتی۔ اب یہ سراسر اللہ ہی کا فضل تھا کہ ان نازک گھڑیوں میں مسلمانوں کو رسولِ پاکؐ کی رہنمائی پر، دینِ حق کی صداقت پر اور اپنے مشن کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نصیب ہوا۔ اسی کی بنا پر انھوں نے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کیا کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آئے، سب گوارا ہے۔ اسی کی بنا پر وہ خوف، گھبراہٹ، اشتعال، مایوسی، ہر چیز سے محفوظ رہے۔ اسی کی بدولت ان کے کیمپ میں پُورا نظم وضبط برقرار رہا۔ اور اسی کی وجہ سے انھوں نے شرائطِ صلح پر سخت کَبیدہ خاطر ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہی وہ سکینت تھی جو اللہ نے مومنوں کے دلوں میں اُتاری تھی، اور اسی کی یہ برکت تھی کہ عُمرے کے لیے نکلنے کا خطرناک ترین اقدام بہترین کامیابی کا مُوجب بن گیا۔

۷ - یعنی ایک ایمان تو وہ تھا جو اِس مہم سے پہلے اُن کو حاصل تھا، اور اُس پر مزید ایمان اُنھیں اِس وجہ سے حاصل ہوا کہ اس مہم کے سلسلے میں جتنی شدید آزمایشیں پیش آتی چلی گئیں، اُن میں سے ہر ایک میں وہ اخلاص، تقویٰ اور اطاعت کی رَوِش پر ثابت قدم رہے۔ یہ آیت بھی من جملہ اُن آیات کے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان ایک جامد و ساکن حالت نہیں ہے، بلکہ اس میں ترقی بھی ہوتی ہے اور تنزّل بھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد سے مرتے دم تک مومن کو زندگی میں قدم قدم پر ایسی آزمایشوں سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے جن میں اس کے لیے یہ سوال فیصلہ طلب ہوتا ہے کہ آیا وہ اللہ کے دین کی پیروی میں اپنی جان، مال، جذبات، خواہشات، اوقات، آسایشوں اور مفادات کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔ ایسی ہر آزمایش کے موقع پر اگر وہ قربانی کی راہ اختیار کر لے تو اس کے ایمان کو ترقی اور بالیدگی نصیب ہوتی ہے، اور اگر منہ موڑ جائے تو اس کا ایمان ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے جب وہ ابتدائی سرمایۂ ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے جسے لیے ہوئے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، تفسیر سورۂ اَنفال، حاشیہ ۲۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۳۸)

۸ - مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پاس تو ایسے لشکر ہیں جن سے وہ کفّار کو جب چاہے تہس نہس کر دے، مگر اس نے کچھ جان کر اور حکمت ہی کی بنا پر یہ ذمّہ داری اہلِ ایمان پر ڈالی ہے کہ وہ کفّار کے مقابلے میں جِدّ و جُہد اور کش مکش کر کے اللہ کے دین کا بول بالا کریں۔ اسی سے ان کے لیے درجات کی ترقی اور آخرت کی کامیابیوں کا دروازہ کھلتا ہے، جیسا کہ آگے کی آیت بتا رہی ہے۔

۹ - قرآنِ مجید میں بالعُموم اہلِ ایمان کے اجر کا ذکر مجموعی طور پر کیا جاتا ہے، مردوں اور عورتوں کو اجر ملنے کی الگ الگ تصریح نہیں کی جاتی۔ لیکن یہاں چونکہ یکجائی ذکر پر اکتفا کرنے سے یہ گمان پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید یہ اجر صرف مردوں کے لیے ہو،

QuranUrdu.com

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ
فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۵ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَ
الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ
وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۶

نہریں بہ رہی ہوں گی اور اُن کی بُرائیاں اُن سے دُور کر دے[10] ــــــ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے ــــــ اور اُن منافق مَردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق بُرے گمان رکھتے ہیں[11]۔ بُرائی کے پھیر میں وہ خود ہی آ گئے[12]، اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنّم مہیّا کر دی جو بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کے متعلّق الگ صراحت کر دی کہ وہ بھی اس اجر میں مومن مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جن خدا پرست خواتین نے اپنے شوہروں، بیٹوں، بھائیوں اور باپوں کو اِس خطرناک سفر پر جانے سے روکنے اور آہ وفُغاں سے اُن کے حوصلے پست کرنے کے بجائے ان کی ہمّت افزائی کی، جنھوں نے ان کے پیچھے ان کے گھر، ان کے مال، ان کی آبرو اور ان کے بچّوں کی محافظ بن کر انھیں اِس طرف سے بے فکر کر دیا، جنھوں نے اِس اندیشے سے بھی کوئی واویلا نہ مچایا کہ چودہ سو صحابیوں کے یک لخت چلے جانے کے بعد کہیں گِرد و پیش کے کفّار و منافقین شہر پر نہ چڑھ آئیں، وہ یقیناً گھر بیٹھنے کے باوجود جہاد کے اجر میں اپنے مَردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہونی ہی چاہیے تھیں۔

۱۰ – یعنی بَشَری کمزوریوں کی بنا پر جو کچھ بھی قصُور ان سے سرزد ہو گئے ہوں انھیں معاف کر دے، جنّت میں داخل کرنے سے پہلے اُن قصوروں کے ہر اثر سے اُن کو پاک کر دے، اور جنت میں وہ اس طرح داخل ہوں کہ کوئی داغ ان کے دامن پر نہ ہو جس کی وجہ سے وہ وہاں شرمندہ ہوں۔

۱۱ – اطرافِ مدینہ کے منافقین کو تو اِس موقع پر یہ گمان تھا، جیسا کہ آگے آیت ۱۲ میں بیان ہوا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی اِس سفر سے زندہ واپس نہ آ سکیں گے۔ رہے مکّے کے مشرکین اور ان کے ہم مَشْرَب کفّار، تو وہ اس خیال میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو عُمرے سے روک کر وہ گویا آپؐ کو زَک دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان دونوں گروہوں نے یہ جو کچھ بھی سوچا تھا، اس کی تہ میں درحقیقت اللہ تعالیٰ کے متعلّق یہ بدگمانی کام کر رہی تھی کہ وہ اپنے نبی کی مدد نہ کرے گا اور حق و باطل کی اس کشمکش میں باطل کو حق کا بول نیچا کرنے کی کھلی چھوٹ دے دے گا۔

۱۲ – یعنی جس انجامِ بد سے وہ بچنا چاہتے تھے اور جس سے بچنے کے لیے انھوں نے یہ تدبیریں کی تھیں، اسی کے پھیر میں

QuranUrdu.com

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۷
اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۸ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۹

زمین اور آسمانوں کے لشکر اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔[۱۳]
اَے نبیؐ! ہم نے تم کو شہادت دینے والا[۱۴]، بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا[۱۵] بنا کر بھیجا ہے، تاکہ اَے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اُس کا ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔[۱۶]

وہ آ گئے اور ان کی وہی تدبیریں اُس انجام کو قریب لانے کا سبب بن گئیں۔

۱۳- یہاں اِس مضمون کو ایک دوسرے مقصد کے لیے دُہرایا گیا ہے۔ آیت ۴ میں اُسے اِس غرض کے لیے بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مقابلے میں لڑنے کا کام اپنے فوق الفطری لشکروں سے لینے کے بجائے مومنین سے اس لیے لیا ہے کہ وہ ان کو نوازنا چاہتا ہے۔ اور یہاں اس مضمون کو دوبارہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو سزا دینا چاہے، اس کی سرکوبی کے لیے وہ اپنے بے شمار لشکروں میں سے جس کو چاہے استعمال کر سکتا ہے، کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنی تدبیروں سے وہ اُس کی سزا کو ٹال سکے۔

۱۴- شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے شاہد کا ترجمہ ''اظہارِ حق کنندہ'' فرمایا ہے اور دوسرے مترجمین اس کا ترجمہ ''گواہی دینے والا'' کرتے ہیں۔ شہادت کا لفظ ان دونوں مفہومات پر حاوی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ احزاب، حاشیہ ۸۲)

۱۵- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارُم، تفسیر سورۂ اَحزاب، حاشیہ ۸۳۔

۱۶- بعض مفسّرین نے تُعَزِّرُوْهُ اور تُوَقِّرُوْهُ کی ضمیروں کا مَرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ ''تم رسول کا ساتھ دو اور اس کی تعظیم و توقیر کرو، اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔'' لیکن ایک ہی سلسلۂ کلام میں ضمیروں کے دو الگ الگ مرجع قرار دینا، جب کہ اس کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، دُرست نہیں معلوم ہوتا۔ اسی لیے مفسّرین کے ایک دوسرے گروہ نے تمام ضمیروں کا مرجع اللہ تعالیٰ ہی کو قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ''تم اللہ کا ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو''۔

صبح و شام تسبیح کرنے سے مراد صرف صبح و شام ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت تسبیح کرتے رہنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں:

QuranUrdu.com

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ
اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ
اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ؑ ﴿١٠﴾

ع ۱۰/۹

اَے نبیؐ! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے[۱۷]، وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا[۱۸]۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا، اُس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا، اور جو اُس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے[۱۹]، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا ؑ

"فلاں بات کا شُہرہ مشرق و مغرب میں پھیلا ہوا ہے"، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف مشرق اور مغرب کے لوگ اس بات کو جانتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔

۱۷- اشارہ ہے اُس بیعت کی طرف جو مکۂ معظّمہ میں حضرت عثمانؓ کے شہید ہو جانے کی خبر سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے حُدَیبِیَہ کے مَقام پر لی تھی۔ بعض رِوایات کی رُو سے یہ بیعت علی الموت تھی، اور بعض رِوایات کے مطابق بیعت اِس بات پر لی گئی تھی کہ ہم میدانِ جنگ سے پیٹھ نہ پھیریں گے۔ پہلی بات حضرت سَلَمَہؓ بن اَکوَع سے مروی ہے، اور دوسری حضراتِ ابنِ عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ اور مَعْقِلؓ بن یَسار سے۔ مآل دونوں کا ایک ہی ہے۔ صحابہؓ نے رسولِ پاکؐ کے ہاتھ پر بیعت اس بات کی کی تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا معاملہ اگر صحیح ثابت ہوا تو وہ سب یہیں اور اسی وقت قریش سے نمٹ لیں گے، خواہ نتیجے میں وہ سب کٹ ہی کیوں نہ مریں۔ اِس موقع پر چونکہ یہ امر ابھی یقینی نہیں تھا کہ حضرت عثمانؓ واقعی شہید ہو چکے ہیں یا زندہ ہیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف سے خود اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بیعت فرمائی، اور اس طرح ان کو یہ شَرَفِ عظیم حاصل ہوا کہ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک کو ان کے ہاتھ کا قائم مَقام بنا کر انھیں اس بیعت میں شریک فرمایا۔ حضورؐ کا اُن کی طرف سے خود بیعت کرنا لازماً یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ حضورؐ کو ان پر پُوری طرح یہ اعتماد تھا کہ اگر وہ موجود ہوتے تو یقیناً بیعت کرتے۔

۱۸- یعنی جس ہاتھ پر لوگ اس وقت بیعت کر رہے تھے وہ شخصِ رسول کا ہاتھ نہیں بلکہ اللہ کے نمایندے کا ہاتھ تھا، اور یہ بیعت رسول کے واسطے سے درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو رہی تھی۔

۱۹- اس مَقام پر ایک لطیف نکتہ نگاہ میں رہنا چاہیے۔ عربی زبان کے عام قاعدے کی رُو سے یہاں عٰهَدَ عَلَيْهِ اللّٰهَ پڑھا جانا چاہیے تھا، لیکن اس عام قاعدے سے ہٹ کر اس جگہ عَلَيْهُ اللّٰهَ پڑھا جاتا ہے۔ علامہ آلُوسیؒ نے اس غیر معمولی اِعراب کے دو وجوہ بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ اس خاص موقع پر اُس ذات کی بزرگی اور جلالتِ شان کا اظہار مقصود ہے

QuranUrdu.com

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا
فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ
قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ
اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ⑪

اَے نبیؐ! بدوی عربوں[20] میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے، اب وہ آ کر ضرور تم سے کہیں گے کہ ”ہمیں اپنے اموال اور بال بچّوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا، آپ ہمارے لیے مغفرت کی دُعا فرمائیں۔“ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں[21]۔ ان سے کہنا: ”اچھا، یہی بات ہے تو کون تمھارے معاملے میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے اگر وہ تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمھارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے[22]۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو)

جس کے ساتھ یہ عہد استوار کیا جا رہا تھا، اس لیے یہاں عَلَيْهِ کے بجائے عَلَيْهُ ہی زیادہ مناسب ہے۔ دوسرے یہ کہ عَلَيْهِ میں ہ دراصل ھُوَ کی قائم مقام ہے اور اس کا اصلی اِعراب پیش ہی تھا نہ کہ زیر۔ لہٰذا یہاں اس کے اصلی اِعراب کو باقی رکھنا وفائے عہد کے مضمون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۲۰ – یہ اَطرافِ مدینہ کے اُن لوگوں کا ذکر ہے جنھیں عُمرے کی تیاری شروع کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی، مگر وہ ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود صرف اس لیے اپنے گھروں سے نہ نکلے تھے کہ انھیں اپنی جان عزیز تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلم، مُزَیْنَہ، جُہَیْنَہ، غِفار، اَشْجَع، دِیل وغیرہ قبائل کے لوگ تھے۔

۲۱ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ تمھارے مدینہ پہنچنے کے بعد یہ لوگ اپنے نہ نکلنے کے لیے جو عذر اب پیش کریں گے وہ محض ایک جھوٹا بہانہ ہوگا، ورنہ ان کے دل جانتے ہیں کہ وہ دراصل کیوں بیٹھ رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کا اللہ کے رسولؐ سے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا محض زبانی جمع خرچ ہوگا۔ اصل میں وہ نہ اپنی اس حرکت پر نادم ہیں، نہ انھیں یہ احساس ہے کہ انھوں نے رسولؐ کا ساتھ نہ دے کر کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اور نہ ان کے دل میں مغفرت کی کوئی طلب ہے۔ اپنے نزدیک تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اس خطرناک سفر پر نہ جا کر بڑی عقلمندی کی ہے۔ اگر انھیں واقعی اللہ اور اس کی مغفرت کی کوئی پروا ہوتی تو وہ گھر بیٹھے ہی کیوں رہتے۔

QuranUrdu.com

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ

بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسولؐ اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آ سکیں گے اور یہ خیال تمھارے دلوں کو بہت بھلا لگا[۲۳] اور تم نے بہت بُرے گمان کیے اور تم سخت بد[۲۴] باطن لوگ ہو۔"

اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں، ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیّا کر رکھی ہے[۲۵]۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے۔ جسے چاہے

۲۲- یعنی اللہ کا فیصلہ تو اُس علم کی بنا پر ہوگا جو وہ تمھارے عمل کی حقیقت کے متعلق رکھتا ہے۔ اگر تمھارا عمل سزا کا مستحق ہو اور میں تمھارے لیے مغفرت کی دعا کر دوں تو میری یہ دعا تمھیں اللہ کی سزا سے نہ بچا دے گی۔ اور اگر تمھارا عمل سزا کا مستحق نہ ہو اور میں تمھارے حق میں اِستِغفار نہ کروں تو میرا اِستِغفار نہ کرنا تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے گا۔ اختیار میرا نہیں بلکہ اللہ کا ہے، اور اس کو کسی کی زبانی باتیں دھوکا نہیں دے سکتیں۔ اس لیے تمھارے ظاہری قول کو مَیں سچ مان بھی لُوں اور اس بنا پر تمھارے حق میں دعائے مغفرت بھی کر دوں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۲۳- یعنی تم اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ رسولؐ اور اس کا ساتھ دینے والے اہلِ ایمان جس خطرے کے منہ میں جا رہے ہیں، اس سے تم نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ تمھاری نگاہ میں یہ بڑی دانش مندی کا کام تھا۔ اور تمھیں اس بات پر بھی خوش ہوتے ہوئے کوئی شرم نہ آئی کہ رسولؐ اور اہلِ ایمان ایک ایسی مہم پر جا رہے ہیں جس سے وہ بچ کر نہ آئیں گے۔ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی تم اس پر مضطرب نہ ہوئے، بلکہ اپنی یہ حرکت تمھیں بہت اچھی معلوم ہوئی کہ تم نے اپنے آپ کو رسولؐ کے ساتھ اس خطرے میں نہیں ڈالا۔

۲۴- اصل الفاظ ہیں: كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا۔ بُور جمع ہے بائر کی۔ اور بائر کے دو معنی ہیں۔ ایک، فاسد، بگڑا ہوا آدمی، جو کسی بھلے کام کے لائق نہ ہو، جس کی نیّت میں فساد ہو۔ دوسرے، ہالک، بد انجام، تباہی کے راستے پر جانے والا۔

۲۵- یہاں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر اور ایمان سے خالی قرار دیتا ہے جو اللہ اور اس کے دین کے معاملے میں مخلص نہ ہوں اور آزمایش کا وقت آنے پر دین کی خاطر اپنی جان و مال اور اپنے مفاد کو خطرے میں ڈالنے سے جی چُرا جائیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ وہ کفر نہیں ہے جس کی بنا پر دنیا میں کسی شخص یا گروہ کو خارج از اسلام قرار دے دیا جائے، بلکہ وہ

QuranUrdu.com

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾
سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا
ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ

معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے، اور وہ غفور و رحیم ہے۔[۲۶]

جب تم مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔[۲۷] یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔[۲۸] اِن سے

کفر ہے جس کی بنا پر آخرت میں وہ غیر مومن قرار پائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کے نُزول کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو، جن کے بارے میں یہ نازل ہوئی تھی، خارج از اسلام قرار نہیں دیا، اور نہ ان سے وہ معاملہ کیا جو کفار سے کیا جاتا ہے۔

۲۶ – اُوپر کی شدید تنبیہ کے بعد اللہ کے غَفور و رحیم ہونے کا ذکر اپنے اندر نصیحت کا ایک لطیف پہلو رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اب بھی اپنی غیر مخلصانہ رَوِش کو چھوڑ کر تم لوگ اخلاص کی راہ پر آجاؤ تو اللہ کو تم غفور و رحیم پاؤ گے۔ وہ تمھاری پچھلی کوتاہیوں کو معاف کر دے گا، اور آیندہ تمھارے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کے تم اپنے خلوص کی بنا پر مستحق ہو گے۔

۲۷ – یعنی عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب یہی لوگ، جو آج خطرے کی مہم پر تمھارے ساتھ جانے سے جی چُرا گئے تھے، تمھیں ایک ایسی مہم پر جاتے دیکھیں گے جس میں ان کو آسان فتح اور بہت سے اموالِ غنیمت کے حُصول کا امکان نظر آئے گا، اور اس وقت یہ خود دوڑے آئیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ یہ وقت صلحِ حُدَیبیہ کے تین ہی مہینے بعد آ گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے فتح کر لیا۔ اس وقت ہر شخص کو یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ قریش سے صلح ہو جانے کے بعد اب خَیبَر ہی کے نہیں، بلکہ تَیما، فَدَک، وادی القُریٰ، اور شمالی حجاز کے دوسرے یہودی بھی مسلمانوں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور یہ ساری بستیاں پکّے پھل کی طرح اسلامی حکومت کی گود میں آ گریں گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن آیات میں پیشگی خبردار کر دیا کہ اطرافِ مدینہ کے یہ موقع پرست لوگ اِن آسان فتوحات کو حاصل ہوتے دیکھ کر ان میں حصّہ بٹا لینے کے لیے آ کھڑے ہوں گے، مگر تم انھیں صاف جواب دے دینا کہ ان میں حصّہ لینے کا موقع تمھیں ہرگز نہ دیا جائے گا، بلکہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جو خطرات کے مقابلے میں سرفروشی کے لیے آگے بڑھے تھے۔

۲۸ – اللہ کے فرمان سے مراد یہ فرمان ہے کہ خیبر کی مہم پر حضورؐ کے ساتھ صرف اُنھی لوگوں کو جانے کی اجازت دی جائے گی جو حُدَیبیہ کی مہم پر آپؐ کے ساتھ گئے تھے اور بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خیبر کے اموالِ غنیمت انھی

QuranUrdu.com

لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ
تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۵ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ
مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ
تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ

صاف کہہ دینا کہ ”تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے، اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔[۲۹]“ یہ کہیں گے کہ ”نہیں، بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔“ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ اِن پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ ”عنقریب تمھیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بُلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔[۳۰] اُس وقت اگر تم نے حکمِ جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمھیں اچھا اجر دے گا،

کے لیے مخصوص فرما دیے تھے، جیسا کہ آگے آیت ۱۸ میں بصراحت ارشاد ہوا ہے۔

۲۹- ”اللہ پہلے یہ فرما چکا ہے“ کے الفاظ سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس آیت سے پہلے کوئی حکم اس مضمون کا آیا ہوا ہوگا جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اور چونکہ اس سورہ میں اِس مضمون کا کوئی حکم اِس آیت سے پہلے نہیں ملتا، اس لیے انھوں نے قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر اسے تلاش کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ سورۂ توبہ کی آیت ۸۳ اُنھیں مل گئی جس میں یہی مضمون ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ آیت اِس کی مِصداق نہیں ہے، کیونکہ وہ غزوۂ تبوک کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی، جس کا زمانۂ نزول سورۂ فتح کے زمانۂ نُزول سے تین سال بعد کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِس آیت کا اشارہ خود اِسی سورہ کی آیات ۱۸-۱۹ کی طرف ہے، اور اللہ کے پہلے فرما چکنے کا مطلب اِس آیت سے پہلے فرمانا نہیں ہے، بلکہ مُخلَّفین کے ساتھ اِس گفتگو سے پہلے فرمانا ہے۔ مُخلَّفین کے ساتھ یہ گفتگو، جس کے متعلق یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگی ہدایات دی جا رہی ہیں، خیبر کی مہم پر جانے کے وقت ہونے والی تھی، اور یہ پُوری سورت، جس میں آیات ۱۸-۱۹ بھی شامل ہیں، اُس سے تین مہینے پہلے حُدَیبیہ سے پلٹتے وقت راستے میں نازل ہو چکی تھی۔ سلسلۂ کلام کو غور سے دیکھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو یہ ہدایت دے رہا ہے کہ جب تمھارے مدینہ واپس ہونے کے بعد یہ پیچھے رہ جانے والے لوگ آ کر تم سے یہ عُذرات بیان کریں تو ان کو یہ جواب دینا، اور خیبر کی مہم پر جاتے وقت جب وہ تمھارے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کریں تو اُن سے یہ کہنا۔

۳۰- اصل الفاظ ہیں: اَوْ يُسْلِمُوْنَ۔ اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اِسلام قبول

QuranUrdu.com

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى
الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾ ع

النصف ع ۲ ۱۰

اور اگر تم پھر اُسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا۔ اگر اندھا اور لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں[۳۱]۔ جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے اُن جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اور جو منہ پھیرے گا، اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔'' ع

کرلیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرلیں۔

۳۱- یعنی جس آدمی کے لیے شریکِ جہاد ہونے میں واقعی کوئی صحیح عذر مانع ہو اُس پر تو کوئی گرفت نہیں، مگر ہٹّے کٹّے لوگ اگر بہانے بنا کر بیٹھ رہیں تو ان کو اللہ اور اس کے دین کے معاملے میں مخلص نہیں مانا جا سکتا اور انھیں یہ موقع نہیں دیا جا سکتا کہ مسلم معاشرے میں شامل ہونے کے فوائد تو سمیٹتے رہیں، مگر جب اسلام کے لیے قربانیاں دینے کا وقت آئے تو اپنی جان و مال کی خیر منائیں۔

اِس مقام پر یہ بات جان لینی چاہیے کہ شریعت میں جن لوگوں کو شریکِ جہاد ہونے سے معاف رکھا گیا ہے، وہ دو قسم کے لوگ ہیں: ایک، وہ جو جسمانی طور پر جنگ کے قابل نہ ہوں، مثلاً کم سِن لڑکے، عورتیں، مجنون، اندھے، ایسے مریض جو جنگی خدمات انجام نہ دے سکتے ہوں، اور ایسے معذور جو ہاتھ یا پاؤں بیکار ہونے کی وجہ سے جنگ میں حصّہ نہ لے سکیں۔ دوسرے، وہ لوگ جن کے لیے کچھ اور معقول اسباب سے شاملِ جہاد ہونا مشکل ہو، مثلاً غلام، یا وہ لوگ جو لڑنے کے لیے تو تیار ہوں، مگر ان کے لیے آلاتِ جنگ اور دوسرے ضروری وسائل فراہم نہ ہو سکیں، یا ایسے قرض دار جنھیں جلدی سے جلدی اپنا قرض ادا کرنا ہو اور قرض خواہ انھیں مہلت نہ دے رہا ہو، یا ایسے لوگ جن کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک زندہ ہو اور وہ اس کا محتاج ہو کہ اولاد اس کی خبر گیری کرے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ والدین اگر مسلمان ہوں تو اولاد کو ان کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہ جانا چاہیے، لیکن اگر وہ کافر ہوں تو ان کے روکنے سے کسی شخص کا رُک جانا جائز نہیں ہے۔

QuranUrdu.com

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے[۳۲] تھے۔

۳۲- یہاں پھر اُسی بیعت کا ذکر ہے جو حُدَیبیہ کے مَقام پر صحابۂ کرامؓ سے لی گئی تھی۔ اس بیعت کو بیعتِ رِضوان کہا جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ وہ اُن لوگوں سے راضی ہو گیا جنھوں نے اس خطرناک موقع پر جان کی بازی لگا دینے میں ذرّہ برابر تأمّل نہ کیا اور رسولؐ کے ہاتھ پر سرفروشی کی بیعت کر کے اپنے صادق الایمان ہونے کا صریح ثبوت پیش کر دیا۔ وقت وہ تھا کہ مسلمان صرف ایک ایک تلوار لیے ہوئے آئے تھے۔ صرف چودہ سو کی تعداد میں تھے۔ جنگی لباس میں بھی نہ تھے، بلکہ احرام کی چادریں باندھے ہوئے تھے۔ اپنے جنگی مُستَقِر (مدینہ) سے ڈھائی سو میل دُور تھے، اور دشمن کا گڑھ، جہاں سے وہ ہر قسم کی مدد لا سکتا تھا، صرف ۱۳ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کے لیے اِن لوگوں کے اندر خلوص کی کچھ بھی کمی ہوتی تو وہ اس انتہائی خطرناک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ جاتے اور اسلام کی بازی ہمیشہ کے لیے ہَر جاتی۔ ان کے اپنے اخلاص کے سوا کوئی خارجی دباؤ ایسا نہ تھا جس کی بنا پر وہ اس بیعت کے لیے مجبور ہوتے۔ ان کا اُس وقت خدا کے دین کے لیے مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ وہ اپنے ایمان میں صادق و مخلص اور خدا اور رسولؐ کی وفاداری میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سندِ خوشنودی عطا فرمائی۔ اور اللہ کی سندِ خوشنودی عطا ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص ان سے ناراض ہو، یا ان پر زبانِ طعن دراز کرے تو اس کا معارضہ اُن سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے۔ اس پر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس وقت اللہ نے اِن حضرات کو یہ خوشنودی کی سند عطا کی تھی، اُس وقت تو یہ مخلص تھے مگر بعد میں یہ خدا اور رسولؐ کے بے وفا ہو گئے، وہ شاید اللہ سے یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ اُسے یہ آیت نازل کرتے وقت اُن کے مستقبل کی خبر نہ تھی، اس لیے محض اُس وقت کی حالت دیکھ کر اُس نے یہ پروانہ انھیں عطا کر دیا، اور غالباً اِسی بے خبری کی بنا پر اسے اپنی کتابِ پاک میں بھی درج فرما دیا، تاکہ بعد میں بھی، جب یہ لوگ بے وفا ہو جائیں، ان کے بارے میں دنیا یہ آیت پڑھتی رہے اور اُس خدا کے علمِ غیب کی داد دیتی رہے جس نے، معاذ اللہ، ان بیوفاؤں کو یہ پروانۂ خوشنودی عطا کیا تھا۔

جس درخت کے نیچے یہ بیعت ہوئی تھی اس کے متعلق حضرت نافعؒ مَولیٰ ابنِ عمرؓ کی یہ رِوایت عام طور پر مشہور ہو گئی ہے کہ لوگ اُس کے پاس جا جا کر نمازیں پڑھنے لگے تھے، حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے لوگوں کو ڈانٹا اور اس درخت کو کٹوا دیا۔ (طَبَقاتِ ابنِ سعد، ج ۲، ص ۱۰۰) لیکن متعدّد رِوایات اس کے خلاف بھی ہیں۔ ایک رِوایت خود حضرت نافعؒ ہی سے طَبَقاتِ ابنِ سعد میں یہ منقول ہوئی ہے کہ بیعتِ رضوان کے کئی سال بعد صحابۂ کرامؓ نے اس درخت کو تلاش کیا، مگر اسے پہچان نہ سکے اور اس امر میں اختلاف ہو گیا کہ وہ درخت کون سا تھا۔ (ص ۱۰۵) دوسری رِوایت بخاری و مسلم اور طَبَقاتِ ابنِ سعد میں حضرت سعید بن المُسَیَّبؒ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ دوسرے سال جب ہم لوگ عمرۃ القضا کے لیے گئے تو ہم اس درخت کو بُھول چکے تھے، تلاش کرنے پر بھی ہم اسے نہ پا سکے۔ تیسری

QuranUrdu.com

فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ
فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا
حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ
لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً

ان کے دلوں کا حال اُس کو معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی[۳۳]، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی، اور بہت سا مالِ غنیمت انھیں عطا کر دیا جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے[۳۴]۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ اللہ تم سے بکثرت اموالِ غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنھیں تم حاصل کرو گے[۳۵]۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمھیں عطا کر دی[۳۶] اور لوگوں کے ہاتھ تمھارے خلاف اُٹھنے سے روک دیے[۳۷]، تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی

روایت ابنِ جَرِیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے عہدِ خلافت میں جب حُدَیبِیَہ کے مَقام سے گزرے تو انھوں نے دریافت کیا کہ وہ درخت کہاں ہے جس کے نیچے بیعت ہوئی تھی۔ کسی نے کہا فُلاں درخت ہے، اور کسی نے کہا فُلاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: چھوڑو، اس تکلُّف کی کیا حاجت ہے۔

۳۳- یہاں سکینت سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر ایک شخص کسی مقصدِ عظیم کے لیے ٹھنڈے دل سے پُورے سُکون و اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو خطرے کے منہ میں جھونک دیتا ہے اور کسی خوف یا گھبراہٹ کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ کام بہرحال کرنے کا ہے، خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔

۳۴- یہ اشارہ ہے خیبر کی فتح اور اس کے اموالِ غنیمت کی طرف۔ اور یہ آیت اس امر کی تصریح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص فرما دیا تھا جو بیعتِ رضوان میں شریک تھے، اُن کے سوا کسی کو اس فتح اور ان غنائم میں شریک ہونے کا حق نہ تھا۔ اسی بنا پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفر ۷ھ میں خیبر پر چڑھائی کرنے کے لیے نکلے تو آپؐ نے صرف انھی کو اپنے ساتھ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں حضورؐ نے حَبَش سے واپس آنے والے مہاجرین اور بعض دَوسی اور اَشْعَرِی صحابیوں کو بھی اموالِ خیبر میں سے کچھ حصّہ عطا فرمایا، مگر وہ یا تو خُمس میں سے تھا، یا اصحابِ رضوان کی رضامندی سے دیا گیا۔ کسی کو حق کے طور پر اس مال میں حصّہ دار نہیں بنایا گیا۔

۳۵- اس سے مراد وہ دوسری فتوحات ہیں جو خیبر کے بعد مسلمانوں کو مسلسل حاصل ہوتی چلی گئیں۔

۳۶- اس سے مراد ہے صلحِ حُدَیبِیَہ جس کو سورت کے آغاز میں فتحِ مبین قرار دیا گیا ہے۔

QuranUrdu.com

لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٢٠﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا
عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾ وَلَوْ
قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ
لَا نَصِيْرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِىْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ

بن جائے[۳۸] اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمھیں ہدایت بخشے[۳۹]۔ اِس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی تک قادر نہیں ہوئے ہو اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے[۴۰]، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ کافر لوگ اگر اِس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے[۴۱]۔ یہ اللہ کی سنّت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے[۴۲]، اور تم اللہ کی سنّت میں کوئی

۳۷- یعنی کفّارِ قریش کو یہ ہمّت اس نے نہ دی کہ وہ حُدَیبِیَہ کے مَقام پر تم سے لڑ جاتے، حالانکہ تمام ظاہری حالات کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے، اور جنگی نقطۂ نظر سے تمھارا پلّا ان کے مقابلے میں بہت کمزور نظر آتا تھا۔ مزید برآں اس سے مراد یہ بھی ہے کہ کسی دشمن طاقت کو اس زمانے میں مدینے پر بھی حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوئی، حالانکہ چودہ سو مردانِ جنگی کے نکل جانے کے بعد مدینے کا محاذ بہت کمزور ہو گیا تھا اور یہود و مشرکین اور منافقین اس موقع سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔

۳۸- نشانی اس بات کی کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں ثابت قدم رہتا ہے اور اللہ کے بھروسے پر حق اور راستی کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اُسے اللہ کس کس طرح اپنی تائید و نصرت سے نوازتا ہے۔

۳۹- یعنی تمھیں مزید بصیرت اور یقین حاصل ہو، اور آیندہ تم اسی طرح اللہ اور رسولؐ کی اطاعت پر قائم رہو اور اللہ کے اعتماد پر راہِ حق میں پیش قدمی کرتے چلے جاؤ، اور یہ تجربات تمھیں یہ سبق سکھا دیں کہ خدا کا دین جس اِقدام کا تقاضا کر رہا ہو، مومن کا کام یہ ہے کہ خدا کے بھروسے پر وہ اِقدام کر ڈالے، اِس خَیص بَیص میں نہ لگ جائے کہ میری طاقت کتنی ہے اور باطل کی طاقتوں کا زور کتنا ہے۔

۴۰- اغلب یہ ہے کہ یہ اشارہ فتحِ مکّہ کی طرف ہے۔ یہی رائے قَتَادَہؒ کی ہے اور اسی کو ابنِ جَرِیرؒ نے ترجیح دی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تو مکّہ تمھارے قابو میں نہیں آیا ہے، مگر اللہ نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے اور حُدَیبِیَہ کی اس فتح کے نتیجے میں وہ بھی تمھارے قبضے میں آ جائے گا۔

QuranUrdu.com

اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ
بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَ لَوْ لَا رِجَالٌ
مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ
مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ

تبدیلی نہ پاؤ گے۔ وہی ہے جس نے مکّے کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ اُن سے روک دیے، حالانکہ وہ اُن پر تمھیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجدِ حرام سے روکا اور ہَدْی کے اُونٹوں کو اُن کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔[۴۳] اگر (مکّے میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنھیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انھیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی۔ روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل

۴۱ – یعنی حُدَیبیہ میں جنگ کو اللہ نے اس لیے نہیں روکا کہ وہاں تمھارے شکست کھا جانے کا امکان تھا، بلکہ اس کی مَصلحت کچھ دوسری تھی، جسے آگے کی آیتوں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ مَصلحت مانع نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ اس مَقام پر جنگ ہو جانے دیتا تو یقیناً کفار ہی کو شکست ہوتی اور مکّۂ معظّمہ اسی وقت فتح ہو جاتا۔

۴۲ – اس جگہ اللہ کی سنّت سے مراد یہ ہے کہ جو کفّار اللہ کے رسول سے جنگ کرتے ہیں، اللہ اُن کو ذلیل و خوار کرتا ہے اور اپنے رسول کی مدد فرماتا ہے۔

۴۳ – یعنی جس خُلوص اور بے نفسی کے ساتھ تم لوگ دینِ حق کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر آمادہ ہو گئے تھے، اور جس طرح بے چُون و چَرا رسولؐ کی اطاعت کر رہے تھے، اللہ اسے بھی دیکھ رہا تھا، اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ کفّار سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔ اِس صورتِ حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہیں اور اسی وقت تمھارے ہاتھوں سے ان کی سرکوبی کرا دی جاتی۔ لیکن اس کے باوجود ایک مَصلحت تھی جس کی بنا پر اللہ نے تمھارے ہاتھ ان سے اور ان کے ہاتھ تم سے روک دیے۔

QuranUrdu.com

لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾

کرلے۔ وہ مومن الگ ہوگئے ہوتے تو (اہلِ مکّہ میں سے) جو کافر تھے، ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔[۴۴]

۴۴- یہ تھی وہ مَصلَحت جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حُدَیبیہ میں جنگ نہ ہونے دی۔ اس مَصلَحت کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ مکّۂ معظّمہ میں اُس وقت بہت سے مسلمان مرد وزَن ایسے موجود تھے جنھوں نے یا تو اپنا ایمان چھپا رکھا تھا، یا جن کا ایمان معلوم تھا، مگر وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکتے تھے اور ظلم وستم کے شکار ہو رہے تھے۔ اس حالت میں اگر جنگ ہوتی اور مسلمان کفار کو رگیدتے ہوئے مکّۂ معظّمہ میں داخل ہوتے، تو کفّار کے ساتھ ساتھ یہ مسلمان بھی نادانستگی میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارے جاتے، جس سے مسلمانوں کو اپنی جگہ بھی رنج وافسوس ہوتا اور مشرکینِ عرب کو بھی یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ یہ لوگ تو لڑائی میں خود اپنے دینی بھائیوں کو بھی مارنے سے نہیں چُوکتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان بے بس مسلمانوں پر رحم کھا کر، اور صحابۂ کرام کو رنج اور بدنامی سے بچانے کی خاطر اس موقع پر جنگ کو ٹال دیا۔ دوسرا پہلو اس مَصلَحت کا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قریش کو ایک خوں ریز جنگ میں شکست دلوا کر مکّہ فتح کرانا نہ چاہتا تھا، بلکہ اس کے پیشِ نظر یہ تھا کہ دو سال کے اندر ان کو ہر طرف سے گھیر کر اِس طرح بے بس کر دے کہ وہ کسی مزاحمت کے بغیر مغلوب ہو جائیں، اور پھر پُورا کا پُورا قبیلہ اسلام قبول کر کے اللہ کی رحمت میں داخل ہو جائے، جیسا کہ فتحِ مکہ کے موقع پر ہوا۔

اس مَقام پر یہ فقہی بحث پیدا ہوتی ہے کہ اگر ہماری اور کافروں کی جنگ ہو رہی ہو اور کافروں کے قبضے میں کچھ مسلمان مرد، عورتیں، بچّے اور بوڑھے ہوں جنھیں وہ ڈھال بنا کر سامنے لے آئیں، یا کافروں کے جس شہر پر ہم چڑھائی کر رہے ہوں وہاں کچھ مسلمان آبادی بھی موجود ہو، یا کافروں کا کوئی جنگی جہاز ہماری زد میں ہو اور اس کے اندر کافروں نے کچھ مسلمانوں کو بھی رکھ چھوڑا ہو، تو کیا ایسی صورت میں ہم ان پر گولا باری کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں مختلف فقہا نے جو فیصلے دیے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس حالت میں گولا باری نہیں کرنی چاہیے، اور اس کے لیے وہ اِسی آیت کو دلیل قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بچانے کے لیے ہی تو حُدَیبیہ میں جنگ کو روک دیا۔ (احکام القرآن لِابنُ العَرَبی) لیکن فی الواقع یہ ایک کمزور دلیل ہے۔ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ بات نکلتی ہو کہ ایسی حالت میں حملے کرنا حرام و ناجائز ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ اس سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں مسلمانوں کو بچانے کے لیے حملے سے اجتناب کیا جا سکتا ہے جب کہ اجتناب سے یہ خطرہ نہ ہو کہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا، یا ان پر ہمارے فتح یاب ہونے کے مواقع باقی نہ رہیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یُوسُفؒ، امام زُفَرؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ان حالات میں گولا باری کرنا بالکل جائز ہے، حتّٰی کہ اگر کفّار مسلمانوں کے بچّوں کو ڈھال بنا کر سامنے لا کھڑا کریں تب بھی اُن پر گولی چلانے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اور جو مسلمان اس حالت میں مارے جائیں، اُن کے خون کا کوئی کَفّارہ اور کوئی دِیَت مسلمانوں پر واجب نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجَصّاص۔

QuranUrdu.com

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ

(یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیّت بٹھالی[۴۵] تو

کتاب السِّیَر للامام محمد، باب قطع الماء عن اہل الحرب)

امام سُفیان ثَوریؒ بھی اس حالت میں گولا باری کو جائز رکھتے ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ جو مسلمان اس حالت میں مارے جائیں، ان کی دِیَت تو نہیں، البتہ کفّارہ مسلمانوں پر واجب ہے۔ (احکام القرآن للجَصّاص)

امام اَوزاعیؒ اور لَیث بن سعد کہتے ہیں کہ اگر کفار مسلمانوں کو ڈھال بنا کر سامنے لے آئیں تو ان پر گولی نہیں چلانی چاہیے۔ اسی طرح اگر ہمیں معلوم ہو کہ ان کے جنگی جہاز میں خود ہمارے قیدی بھی موجود ہیں، تو اس حالت میں اس کو غرق نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ہم ان کے کسی شہر پر حملہ کریں اور ہمیں معلوم ہو کہ اس شہر میں مسلمان بھی موجود ہیں، تو اس پر گولا باری کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ امر یقینی نہیں ہے کہ ہمارا گولا مسلمانوں ہی پر جا کر گرے گا، اور اگر کوئی مسلمان اس گولا باری کا شکار ہو جائے تو یہ ہماری طرف سے بالقصد مسلمان کا قتل نہ ہوگا، بلکہ نادانستگی میں ایک حادثہ ہوگا۔ (احکام القرآن للجَصّاص)

امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر اس حالت میں گولا باری کرنا ناگزیر نہ ہو تو مسلمانوں کو ہلاکت سے بچانے کی کوشش کرنا بہتر ہے۔ اگرچہ اس صورت میں گولا باری کرنا حرام نہیں ہے، مگر مکروہ ضرور ہے۔ لیکن اگر فی الواقع اس کی ضرورت ہو، اور اندیشہ ہو کہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو یہ کفار کے لیے جنگی حیثیت سے مفید اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہو گا تو پھر گولا باری کرنا جائز ہے۔ مگر اس حالت میں بھی مسلمانوں کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ مزید برآں امام شافعیؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مَعرِکۂ قِتال میں کفار کسی مسلمان کو ڈھال بنا کر آگے کریں اور کوئی مسلمان اسے قتل کر دے تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ قاتل کو معلوم تھا کہ یہ مسلمان ہے، اور دوسری صورت یہ کہ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ پہلی صورت میں دِیَت اور کفّارہ دونوں واجب ہیں، اور دوسری صورت میں صرف کَفّارہ واجب ہے۔ (مُغنِی المُحتاج)

۴۵ – جاہلانہ حمیّت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص محض اپنی ناک کی خاطر یا اپنی بات کی پَچ میں جان بُوجھ کر ایک ناروا کام کرے۔ کفارِ مکّہ خود جانتے اور مانتے تھے کہ ہر شخص کو حج اور عمرے کے لیے بیت اللہ کی زیارت کا حق حاصل ہے، اور کسی کو اس مذہبی فریضے سے روکنے کا حق نہیں ہے۔ یہ عرب کا قدیم ترین مُسَلَّم آئین تھا۔ لیکن اپنے آپ کو سراسر ناحق پر اور مسلمانوں کو بالکل برسرِ حق جاننے کے باوجود انھوں نے محض اپنی ناک کی خاطر مسلمانوں کو عمرے سے روکا۔ خود مشرکین میں سے جو راستی پسند تھے، وہ بھی یہ کہہ رہے تھے کہ جو لوگ اِحرام باندھ کر ہَدْی کے اُونٹ ساتھ لیے ہوئے عمرہ کرنے آئے ہیں، ان کو روکنا ایک بے جا حرکت ہے۔ مگر قریش کے سردار صرف اِس خیال سے مُزاحَمت پر اَڑے رہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی بڑی جمعیّت کے ساتھ مکّے میں داخل ہو گئے تو تمام عرب میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔ یہی ان کی حمیّتِ جاہلیہ تھی۔

QuranUrdu.com

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ
كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ
عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾ ع لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ ع ۲ ۹
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ

اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت[۴۶] نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اُس کے زیادہ حق دار اور اُس کے اہل تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ع

فی الواقع اللہ نے اپنے رسولؐ کو سچّا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق[۴۷] تھا۔ اِن شاء اللہ[۴۸] تم ضرور مسجدِ حرام میں پُورے امن کے ساتھ داخل ہو گے[۴۹]، اپنے سر منڈواؤ گے

---

۴۶ - یہاں سکینت سے مراد ہے صبر اور وقار، جس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے کفّارِ قریش کی اس جاہلانہ حمیّت کا مقابلہ کیا۔ وہ ان کی اس ہٹ دھرمی اور صریح زیادتی پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر نہ ہوئے، اور اِن کے جواب میں کوئی بات انھوں نے ایسی نہ کی جو حق سے متجاوز اور راستی کے خلاف ہو، یا جس سے معاملہ بخیر و خوبی سلجھنے کے بجائے اور زیادہ بگڑ جائے۔

۴۷ - یہ اُس سوال کا جواب ہے جو بار بار مسلمانوں کے دلوں میں کھٹک رہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب تو یہ دیکھا تھا کہ آپؐ مسجدِ حرام میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے، پھر یہ کیا ہوا کہ ہم عمرہ کیے بغیر واپس جا رہے ہیں۔ اس کے جواب میں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ خواب میں اِسی سال عمرہ ہونے کی تصریح تو نہ تھی، مگر اس کے باوجود ابھی تک کچھ نہ کچھ خلش دلوں میں باقی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود یہ وضاحت فرمائی کہ وہ خواب ہم نے دکھایا تھا، اور وہ بالکل سچّا تھا، اور وہ یقیناً پُورا ہو کر رہے گا۔

۴۸ - یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے وعدے کے ساتھ "اِن شاء اللہ" کے الفاظ جو استعمال فرمائے ہیں، اس پر ایک معترض یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب یہ وعدہ اللہ تعالیٰ خود ہی فرما رہا ہے تو اس کو اللہ کے چاہنے سے مشروط کرنے کے کیا معنیٰ ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں یہ الفاظ اس معنیٰ میں استعمال نہیں ہوئے ہیں کہ اگر اللہ نہ چاہے گا تو اپنا یہ وعدہ پُورا نہ کرے گا، بلکہ دراصل ان کا تعلّق اُس پسِ منظر سے ہے جس میں یہ وعدہ فرمایا گیا ہے۔ کفارِ مکّہ نے جس زَعم کی بنا پر مسلمانوں کو عمرے سے روکنے کا یہ سارا کھیل کھیلا تھا، وہ یہ تھا کہ جس کو ہم عمرہ کرنے دینا چاہیں گے وہ عمرہ کر سکے گا، اور جب ہم اسے کرنے دیں گے اسی وقت وہ کر سکے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ ان کی مَشِیَّت پر نہیں بلکہ ہماری مَشِیَّت پر موقوف ہے۔ اِس سال عمرے کا

QuranUrdu.com

وَ مُقَصِّرِیْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ
ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى
وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ ﴿۲۸﴾

اور بال ترشواؤ گے،[۵۰] اور تمھیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ اُس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے، اس لیے وہ خواب پُورا ہونے سے پہلے اُس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اُس کو پُوری جنسِ دین پر غالب کر دے، اور اِس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔[۵۱]

نہ ہوسکنا اس لیے نہیں ہوا کہ کفّارِ مکّہ نے یہ چاہا تھا کہ وہ نہ ہو، بلکہ یہ اس لیے ہوا کہ ہم نے اس کو نہ ہونے دینا چاہا تھا۔ اور آیندہ یہ عمرہ اگر ہم چاہیں گے تو ہوگا، خواہ کفار چاہیں یا نہ چاہیں۔ اس کے ساتھ ان الفاظ میں یہ معنیٰ بھی پوشیدہ ہیں کہ مسلمان بھی جو عمرہ کریں گے تو اپنے زور سے نہیں کریں گے، بلکہ اس بنا پر کریں گے کہ ہماری مَشِیَّت یہ ہوگی کہ وہ عمرہ کریں۔ ورنہ ہماری مَشِیَّت اگر اس کے خلاف ہو تو ان کا یہ بل بُوتا نہیں ہے کہ خود عمرہ کر ڈالیں۔

۴۹ ۔ یہ وعدہ اگلے سال ذی القعدہ ۷ھ میں پُورا ہوا۔ تاریخ میں یہ عمرہ ''عمرۃ القضاء'' کے نام سے مشہور ہے۔

۵۰ ۔ یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عمرے اور حج میں سرمنڈوانا لازم نہیں ہے، بلکہ بال ترشوانا بھی جائز ہے۔ البتہ سرمنڈوانا افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے بیان فرمایا ہے اور بال ترشوانے کا ذکر بعد میں کیا ہے۔

۵۱ ۔ اس مقام پر یہ بات ارشاد فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ حُدَیبِیَہ میں جب معاہدۂ صلح لکھا جانے لگا تھا، اس وقت کفّارِ مکّہ نے حضورؐ کے اسمِ گرامی کے ساتھ ''رسول اللہ'' کے الفاظ لکھنے پر اعتراض کیا تھا، اور ان کے اصرار پر حضورؐ نے خود معاہدے کی تحریر میں سے یہ الفاظ مٹا دیے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہمارے رسول کا رسول ہونا تو ایک حقیقت ہے، جس میں کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کو اگر کچھ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ اس کے حقیقت ہونے پر صرف ہماری شہادت کافی ہے۔ اُن کے انکار کر دینے سے یہ حقیقت بدل نہیں جائے گی، بلکہ اُن کے عَلَی الرَّغم اُس ہدایت اور اُس دینِ حق کو پُوری جنسِ دین پر غلبہ حاصل ہو کر رہے گا، جسے لے کر یہ رسول ہماری طرف سے آیا ہے، خواہ یہ منکرین اسے روکنے کے لیے کتنا ہی زور مار کر دیکھ لیں۔

''پُوری جنسِ دین'' سے مراد زندگی کے وہ تمام نظام ہیں جو ''دین'' کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس کی مفصّل تشریح ہم اس سے پہلے

QuranUrdu.com

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ
بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز
سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کفّار پر سخت[۵۲] اور آپس میں رحیم ہیں[۵۳]۔ تم جب دیکھو گے اُنھیں رُکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سُجُود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں[۵۴]۔ یہ ہے ان کی صفت

تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ زُمَر، حاشیہ ۳، اور تفسیر سورۂ شُوریٰ حاشیہ ۲۰ میں کر چکے ہیں۔ یہاں جو بات اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت کا مقصد محض اِس دین کی تبلیغ نہ تھا، بلکہ اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام نظاماتِ زندگی پر غالب کر دینا تھا۔ دوسرے الفاظ میں آپؐ یہ دین اس لیے نہیں لائے تھے کہ زندگی کے سارے شعبوں پر غلبہ تو ہو کسی دینِ باطل کا، اور اُس کی قہرمانی کے تحت یہ دین اُن حدود کے اندر سکڑ کر رہے جن میں دینِ غالب اِسے جینے کی اجازت دے دے، بلکہ اسے آپؐ اس لیے لائے تھے کہ زندگی کا غالب دین یہ ہو، اور دوسرا کوئی دین اگر جیے بھی تو اُن حُدود کے اندر جیے جن میں یہ اسے جینے کی اجازت دے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ زُمَر، حاشیہ ۴۸)

۵۲ - اصل الفاظ ہیں: اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔ عَرَبی زبان میں کہتے ہیں: فُلَانٌ شَدِيْدٌ عَلَيْهِ ''فلاں شخص اُس پر شدید ہے''، یعنی اُس کو رام کرنا اور اپنے مطلب پر لانا اُس کے لیے مشکل ہے۔ کفّار پر اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ دُرُشتی اور تُند خوئی سے پیش آتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی، اُصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت، اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفّار کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ موم کی ناک نہیں ہیں کہ انھیں کافر جدھر چاہیں موڑ دیں۔ وہ نرم چارا نہیں ہیں کہ کافر انھیں آسانی کے ساتھ چبا جائیں۔ انھیں کسی خوف سے دبایا نہیں جا سکتا۔ انھیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جا سکتا۔ کافروں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ انھیں اُس مقصدِ عظیم سے ہٹا دیں جس کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے اُٹھے ہیں۔

۵۳ - یعنی اُن کی سختی جو کچھ بھی ہے، دشمنانِ دین کے لیے ہے، اہلِ ایمان کے لیے نہیں ہے۔ اہلِ ایمان کے مقابلے میں وہ نرم ہیں، رحیم و شفیق ہیں، ہمدرد و غمگسار ہیں۔ اُصول اور مقصد کے اتحاد نے ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے مَحبّت اور ہم رنگی و سازگاری پیدا کر دی ہے۔

QuranUrdu.com

منزل۷ التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ

توراۃ میں[۵۵]۔ اور انجیل میں اُن کی مثال یُوں دی گئی ہے[۵۶] کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی،

۵۴- اس سے مراد پیشانی کا وہ گٹّا نہیں ہے جو سجدے کرنے کی وجہ سے بعض نمازیوں کے چہرے پر پڑ جاتا ہے۔ بلکہ اِس سے مراد خدا ترسی، کریم النفسی، شرافت اور حُسنِ اَخلاق کے وہ آثار ہیں جو خدا کے آگے جُھکنے کی وجہ سے فطرتاً آدمی کے چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ انسان کا چہرہ ایک کُھلی کتاب ہوتا ہے، جس کے صفحات پر آدمی کے نفس کی کیفیّات بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک متکبر انسان کا چہرہ ایک متواضع اور منکسر المزاج آدمی کے چہرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک بد اَخلاق آدمی کا چہرہ ایک نیک نفس اور خوش خُلق آدمی کے چہرے سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ ایک لفنگے اور بدکار آدمی کی صورت اور ایک شریف اور پاکباز آدمی کی صورت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ساتھی تو ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی ایک آدمی بیک نظر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ یہ خیر الخلائق ہیں، کیونکہ خدا پرستی کا نُور ان کے چہروں پر چمک رہا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے متعلّق امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ جب صحابۂ کرامؓ کی فوجیں شام کی سرزمین میں داخل ہوئیں تو شام کے عیسائی کہتے تھے کہ مسیحؑ کے حواریوں کی جو شان ہم سنتے تھے، یہ تو اُسی شان کے لوگ نظر آتے ہیں۔

۵۵- غالبًا یہ اشارہ کتابِ اِستِثنا، باب ۳۳، آیات ۲-۳ کی طرف ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمدِ مبارک کا ذکر کرتے ہوئے آپؐ کے صحابہؓ کے لیے ''قُدسیوں'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اگر صحابۂ کرامؓ کی کوئی صفت توراۃ میں بیان ہوئی تھی تو وہ اب موجودہ مُحرّف توراۃ میں نہیں ملتی۔

۵۶- یہ تمثیل حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ایک وعظ میں بیان ہوئی ہے جسے بائبل کے عہد نامۂ جدید میں اِس طرح نقل کیا گیا ہے:

> ''اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے، اور وہ بیج اِس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتّی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیّار دانے، پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے، کیونکہ کاٹنے کا وقت آ پہنچا...... وہ رائی کے دانے کے مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ مگر جب بو دیا گیا تو اُگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے، اور ایسی بڑی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایے میں بسیرا کر سکتے ہیں۔'' (مَرقُس، باب ۴، آیات ۲۶ تا ۳۲۔ اس وعظ کا آخری حصّہ انجیلِ مَتّٰی، باب ۱۳، آیات ۳۱-۳۲ میں بھی ہے)

QuranUrdu.com

فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ
الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً
وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ع

ع ۴

پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے، تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اِس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ [۵۷] ع

۵۷- ایک گروہ اس آیت میں مِنْهُمْ کی مِنْ کو تبعیض کے معنیٰ میں لیتا ہے اور آیت کا ترجمہ یہ کرتا ہے کہ ''ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔'' اس طرح یہ لوگ صحابہؓ پر طعن کا راستہ نکالتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آیت کی رُو سے صحابہؓ میں سے بہت سے لوگ مومن و صالح نہ تھے۔ لیکن یہ تفسیر اِسی سورت کی آیات ۴-۵-۱۸ اور ۲۶ کے خلاف پڑتی ہے، اور خود اِس آیت کے ابتدائی فقروں سے بھی مُطابقت نہیں رکھتی۔ آیات ۴-۵ میں اللہ تعالیٰ نے اُن تمام صحابہؓ کے دلوں میں سکینت نازل کیے جانے اور ان کے ایمان میں اضافہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے جو حُدَیبیہ میں حضورؐ کے ساتھ تھے، اور بلا اِستثنا ان سب کو جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے۔ آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کے حق میں اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے جنھوں نے درخت کے نیچے حضورؐ سے بیعت کی تھی، اور اس میں بھی کوئی اِستثنا نہیں ہے۔ آیت ۲۶ میں بھی حضورؐ کے تمام ساتھیوں کے لیے مومنین کا لفظ استعمال کیا ہے، ان کے اُوپر اپنی سکینت نازل کرنے کی خبر دی ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ لوگ کلمۂ تقویٰ کی پابندی کے زیادہ حق دار اور اِس کے اہل ہیں۔ یہاں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان میں سے جو مومن ہیں صرف انھی کے حق میں یہ خبر دی جا رہی ہے۔ پھر خود اس آیت کے بھی ابتدائی فقروں میں جو تعریف بیان کی گئی ہے، وہ ان سب لوگوں کے لیے ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ الفاظ یہ ہیں کہ جو لوگ بھی آپؐ کے ساتھ ہیں، وہ ایسے اور ایسے ہیں۔ اس کے بعد یکایک آخری فقرے پر پہنچ کر یہ ارشاد فرمانے کا آخر کیا موقع ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ مومن و صالح تھے اور کچھ نہ تھے۔ اس لیے یہاں مِنْ کو تبعیض کے معنیٰ میں لینا نظمِ کلام کے خلاف ہے۔ درحقیقت یہاں مِنْ بیان کے لیے ہے جس طرح آیت فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (بتوں کی گندگی سے بچو) میں مِنْ تبعیض کے لیے نہیں بلکہ لازماً بیان ہی کے لیے ہے، ورنہ آیت کے معنیٰ یہ ہو جائیں گے کہ ''بتوں میں سے جو ناپاک ہیں ان سے پرہیز کرو''، اور اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ بت پاک بھی قرار پائیں گے، جن کی پرستش سے پرہیز لازم نہ ہوگا۔